حافظ محمد اصغر
اسکالر ایم فل اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر سفیر حیدر
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر الماس خانم
استاد شعبہ اردو ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

نجیب محفوظ کے ناولوں کے اردو تراجم: تجزیاتی مطالعہ

Hafiz Muhammad Asghar
Scholar MPhil Urdu, Govt College University, Lahore.
Dr. Safeer Hayder
Assistant Professor, Depatment of Urdu, GC University, Lahore.
Dr. Almas Khanum
Assistant Professor, Depatment of Urdu, GC University, Lahore.

An Analytical Study Urdu Translations of Naguib Mahfooz’s Novels

Naguinb Mahfouz is very known writer of Egypt. He is first Arabian writer who got Noble Prize. He wrote near about forty Novels and many more short stories in Arabic. In this reward he got many National and International awards. These Novels and short stories are being translated in many Languages of World. In his writings Naguib Mahfouz presented old Egyptian culture. Egyptian culture is oldest culture of World but time by time many changings occurred in this culture. Naguib Mahfouz presented both Egyptian cultures in his writings. in context of Egyptian Culture, Naguib Mahfouz presented Global Issues. Naguib Mahfouz's Novels are also translated in Urdu Language like other Languages of world. Three of Urdu Translators Nayer Abbas Zaidi, Fahmida Riyaz and Syed All ud Din introduced Naguib Mahfouz's Novels in Urdu. Aim of this study is to analyze these Novels in Global context.

Key Words: *Naguib Mahfouz, Novels, Urdu Translations.*

نجیب محفوظ(۱۹۱۱ء۔۲۰۰۶ء) مصر کا ایک ایسا زندہ جاوید کردار ہے جس نے مصری ادب کو نہ صرف ایک نئی روح سے آشکار کیا بلکہ بین الاقوامی ادب میں بھی ممتاز مقام کے حامل قرار پائے۔ انہوں نے اپنی ۹۴ سالہ زندگی کے سفر کا

آغاز قاہرہ کے ایک قدیم محلے "جمالیہ" سے کیا۔ یہ سفر صرف نجیب محفوظ کی زندگی کا سفر ہی نہیں بلکہ مصر کی تہذیب کا سفر بھی ہے جس کے ہر ایک منظر، ہر ایک پڑاؤ کو نجیب نے کمال مہارت سے اپنی تحریروں میں اس طور جگہ دی کہ ہر نقش تاریخ کا حصہ بن گیا۔ نجیب "جمالیہ" میں صرف ۱۰ برس کی عمر تک قیام پذیر رہے لیکن قاہرہ کا یہ قدیم محلہ نجیب کی یاداشتوں کے جھرونکوں سے نکل کر ان کی تحریروں میں جگہ پاتا رہا کیونکہ یہ محلہ مصر کی قدیم تہذیب کا آئینہ دار تھا جو کہ نجیب کے لیے قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتی تھی۔ نجیب محفوظ کا تعلیمی سفر ایک مدرسے سے چار سال کی عمر میں شروع ہوا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ "کتاب الشیخ بجیری" اور ' مدرسۃ الحسینیہ الا بتدائیہ" میں حاصل کی قاہرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ میں گریجو ایشن کیا۔ ادب سے لگاؤ نجیب محفوظ کو اوائل عمری ہی سے تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت اور ادبی ذوق کی آبیاری میں ان کی والدہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ نجیب محفوظ کو ان کی والدہ بچپن میں مصر کے میوزیم اور دوسری تاریخی جگہوں پر لے کر جاتی تھیں جس کی وجہ سے نجیب کو تاریخ سے گہری دل چسپی پیدا ہوگئی اور اس کا اثر ان کی تحریروں پر بھی ہوا۔ نجیب محفوظ سکول کے زمانے سے ہی مصر کے بڑے بڑے ادیبوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ وہ بچپن میں ہی طٰہ حسین، محمد حسین ہیکل، اور ابراہیم المزنی جیسے ادیبوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ مغرب کے عظیم ادیبوں سے وابستگی بھی طالب علمی کے زمانے سے ہی تھی۔ شیکسپیئر، فلا بیئر، ٹالسٹائی، میل وال اور بروست جیسے ادیبوں سے متاثر تھے۔ ان تمام ادیبوں کا اثر ان کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ نجیب محفوظ ۱۹۳۶ سے لے کر ۱۹۴۰ ات ' ' جامعہ فواد الاول" میں انتظامی ذمہ داریوں کو سرانجام دیتے رہے بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ وہ اپنے ریٹائرمنٹ کے عرصے تک مختلف سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے بحیثیت وزیر پارلیمانی کے سیکریڑی، محکمہ ثقافت کے مشیر، فلم سنسر شب کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر اپنی خدمات سر انجام دیں۔ نجیب محفوظ کو سیاحت کا زیادہ شوق نہ تھا، انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ملک سے باہر کل تین سفر کئے۔ ایک مرتبہ یمن گئے ایک مرتبہ یوگوسلاویہ اور ایک مرتبہ انگلستان کا سفر کیا۔ نجیب محفوظ کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا انہوں نے ایک طویل عمر اکیلے گزاری ۱۹۵۴ میں شادی کی، ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ قاہرہ کے دریائے نیل کے ساحلی علاقے میں قیام پزیر رہے۔ نجیب محفوظ نے اپنی زندگی میں کئی ملکی اور غیر ملکی اعزاز حاصل کئے۔ انہیں دو مرتبہ مصر کا حکومتی انعام حاصل ہوا۔ سویڈن اکادمی ادبیات نے نوبل انعام سے نوازا۔ امریکہ کی یونیورسٹی سے صدارتی تمغہ اور اعزازی ڈگری سے بھی نوازا گیا۔ نجیب محفوظ تمام عمر صحت مند رہے عمر کے آخری حصہ میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں وہ شدید زخمی ہوئے۔ اس کے بعد وہ بارہ برس زندہ رہے۔ انہوں نے مصری ادب میں بیش بہا اضافے کیے جو کہ درج ذیل ہیں۔

افسانوی مجموعے

۱۔ "همس الجنون" (۱۹۳۸)

۲۔ "دنیا اللہ" (۱۹۶۲)

۳۔ "زاعبلاوی" (۱۹۶۳)

۴۔ "خمارۃ القط الاسود" (۱۹۶۸)

۵۔ ”تخت المظلة“ (۱۹۶۹)

۶۔ ”حکایت بلاویہ ولا نھایہ“ (۱۹۷۱)

۷۔ ”شہر العسل“ (۱۹۷۱)

۸۔ ”الجریمة“ (۱۹۷۳)

ناول

۱۔ ”مصر القدیمة“ (۱۹۳۲)	۲۔ ”عبث الاقدار“ (۱۹۳۹)
۳۔ ”ادوبیس“ (۱۹۴۳)	۴۔ ”کفاح طیبہ“ (۱۹۴۴)
۵۔ ”القاہرة الجدیدة“ (۱۹۴۵)	۶۔ ”خان الخیلی“ (۱۹۴۶)
۷۔ ”زقاق المدق“ (۱۹۴۷)	۸۔ ”السراب“ (۱۹۴۸)
۹۔ ”بدایہ ونھایہ“ (۱۹۴۹)	۱۰۔ ”بین القصرین“ (۱۹۵۶)
۱۱۔ ”قصر الشوق“ (۱۹۵۷)	۱۲۔ ”اولاد خارتنا“ (۱۹۵۹)
۱۳۔ ”اللص ولکلاب“ (۱۹۶۲)	۱۴۔ ”السمان الحریف“ (۱۹۶۲)
۱۵۔ ”الطریق“ (۱۹۶۴)	۱۶۔ ”ثرثرہ فوق النیل“ (۱۹۶۶)
۱۷۔ ”الکرنک“ (۱۹۷۴)	۱۸۔ ”میرامار“ (۱۹۷۶)
۱۹۔ ”حکایات خارتنا“ (۱۹۷۵)	۲۰۔ ”الحرافش“ (۱۹۷۷)
۲۱۔ ”افراخ القبہ“ (۱۹۸۱)	۲۲۔ ”حدیث لصباو المساء“ (۱۹۸۷)

ان تصانیف کے علاوہ نجیب محفوظ نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی جو کہ ۱۹۹۴ میں شائع ہوئی۔

نجیب محفوظ عرب دنیا کا واحد ادیب ہے جس کو نوبل انعام حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ان کی تخلیقی کاوشوں سے عربی ادب کو رفعت حاصل ہوئی۔ نجیب محفوظ کا تخلیقی اثر پوری ادبی دنیا پر پھیل گیا ہے۔ نجیب محفوظ نے اپنے ناولوں، افسانوں میں مصری معاشرت سیاسی و سماجی نظام اور عمرانی تناظر کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے موضوعات کو عام زندگی میں تلاش کرتے ہیں وہ اپنے موضوعات کے بارے میں یوں کہتے ہیں۔” میرے موضوع گھر، سکول، کام، یا سڑک پر ہونے والے واقعات کے متعلق ہوتے ہیں، عام زندگی کے تجربات میری کہانیوں کا موضوع بنتے ہیں۔“ [۱] نجیب محفوظ کی تحریروں میں ماضی اور حال کے واقعات کی خوبصورت آمیزش ہے جو قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے ان کی تحریروں میں فراعین مصر کے زمانے کے واقعات بھی ملتے ہیں اور انقلاب مصر کے زمانے کے بھی، نجیب محفوظ کی تحریریں قدیم تہذیب اور جدید تہذیب کی آئینہ دار ہیں اس حوالہ سے نجیب محفوظ خود کہتے ہیں:

"I am the son of two civilizations that at a certain age in history have formed a happy marriage. The first of these, seven thousand years old, is the Pharaonic civilization; the second, one thousand four hundred years old, is the Islamic civilization." (2)

نجیب محفوظ وطن پرست تھے۔ وہ مصر کے سیاسی و سماجی نظام کو بہتر بنانے کے حامی تھے، وہ اس میں معاشرتی برائیاں ختم کرنا چاہتے تھے وہ عدل اور مساوات پر قائم ریاست کے حامی تھے۔ اس بارے میں وہ یوں کہتے ہیں: "میری نزدیک ایک عظیم سلطنت بنانے یا اہرام تعمیر کرنے سے زیادہ اہمیت انصاف کی ہے۔" (۳)

مصر کا بالزاک کہلانے والے نجیب محفوظ کے علم میں اتنی طاقت تھی کہ وہ قاری کو اس موڑ تک لے جاسکتے تھے جہاں روشنی کی ایک واحد کرن بھی نہ پہنچ سکے۔ اسی منفرد خاصیت کی وجہ سے وہ نوبل انعام کے مستحق ٹھہرے۔ اگر نوبل پرائز نجیب محفوظ جیسے لکھاری کو زندہ نہ رکھتا تو یقیناً آج محفوظ کی کہانیاں بھی جہالت کی بھول بھلیوں میں کہیں دور گم ہو چکی ہوتیں اور ہم تک نہ پہنچ پاتیں۔ نجیب محفوظ نے معاشی رکاوٹوں سے آزاد ہو کر لکھا اور بہت خوب لکھا۔ ان کا ناول "ثرثرۃ فوق النیل" ۱۹۶۶ء میں لکھا گیا۔ اس ناول کے دنیا کی مختلف زبانوں انگریزی، اردو، فرانسیسی، جرمنی، اٹلی وغیرہ میں تراجم ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں "Adrift on the Nile" کے نام سے اردو میں " آبِ نیل پر آوارگی" جیسے خوبصورت نام سے نیئر عباس زیدی کا کیا ہوا ترجمہ منظر عام پر آچکا ہے۔

۱۹۸۸ء میں نوبل انعام کے لئے نجیب کو جب سویڈن مدعو کیا گیا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یورپ کے ممالک کا ہمارے مسائل پر ہنسنے اور تعریف کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تو افریقہ کی عوام کی انتڑیوں سے کھیلنا بند کرو، فلسطین کے مسلمانوں کو اپنی ظلم کی چکی کا پاٹ بنانے کی بجائے انصاف کا معاملہ کرو اور اگر کچھ کر سکتے ہو تو پوری تیسری دنیا سے اپنی استعاری طاقتوں کو ہٹاؤ۔ نوبل انعام دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجیب کی کہانیوں کے اکثر و بیشتر کردار تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور نجیب دراصل اسی طبقے کی ایک نہایت بلند آواز ہے۔ نجیب رنگا رنگ کردار تخلیق کر سکتے ہیں اور ایک پرانے شہر کے گلی کوچوں کو اپنے قلم سے کاغذ پر اتار کر انہیں ابدیت بخش سکتے ہیں۔ انکا ادبی سفر ستر برس پر محیط ہے۔

نجیب محفوظ بیسویں صدی کے عظیم ادیب ہیں۔ ان کی تحریریں قدیم مصری تہذیب کا آئینہ دار بھی ہیں اور جدید مصری سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی مسائل کا نوحہ بھی۔ ان کا قلم رومانی فضا میں بھی سانس لیتا ہے اور جدید مصری تہذیب کے مسائل کو بھی بیان کرتا ہے۔ نجیب محفوظ نے کثیر ادبی سرمایہ چھوڑا جو کہ زیادہ تر ناولوں پر مشتمل ہے۔ ان کے ناولوں کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی اور انگریزی کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ان کے ادب پاروں کے تراجم ہوئے۔

نجیب محفوظ کے ناول: اردو تراجم

(ثرثرۃ فوق النیل ۱۹۶۶ء) آبِ نیل پہ آوارگی

نجیب محفوظ وہ مصنف ہے جو نیل کے ساحل سے بادل بن کر اٹھا اور کاشغر تک چھا گیا۔ جس نے مصر کی قدیم تہذیب میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ ان کے ناول "ثرثرۃ فوق النیل" (۱۹۶۶) کا اردو زبان میں پہلا ترجمہ "آبِ نیل پہ آوارگی" کے نام سے ۲۰۰۴ میں ہوا۔ اس ترجمہ کے ذریعہ نجیب محفوظ نے اپنی وفات سے دو برس قبل پاکستان کی سرزمین پر اپنے قدم رکھے۔ یہ ترجمہ نیئر عباس زیدی (مترجم فرانسس لیارٹیٹ) "Adrift on the Nile" نے "ثرثرہ فوق النیل" کے انگریزی ترجمہ سے ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کے بارے میں حسین ہریدے لکھتے ہیں کہ:

> " Nayyar Abbas Zaidi has done a good work by translating the Egyptian Novel ' Adrift on the Nile' by Naguib Mahfouz from English to Urdu. It was indeed a pleasure to see that Naguib Mahfouz's work is being translated to other languages and people from different Cultures and parts of the World are able to read his work". (4)

نجیب محفوظ کا ناول " آبِ نیل پہ آوارگی" اشاریت کے ابہام پر مبنی تحریر ہے اور ادیب کی شخصیت کے انتشار کی آئینہ دار ہے۔ اس ناول میں جگہ جگہ قدیم اور جدید تہذیبوں کا تصادم ملتا ہے اور تاریخ کے جھروکوں سے نکلتی نئی کونپلیں کہیں سرسبز و شاداب تو کہیں بنجر نظر آتی ہیں۔ یہ ناول عرب ثقافت کی نمائندہ آواز بن کر پوری دنیا پر چھا گیا ہے۔ اس میں زندگی سے متعلق بنیادی سوالات جیسے وقت کا گزرنا، معاشرہ اور روایات، علوم وعقائد، منطق و محبت وغیرہ شامل ہیں۔ جیسا کہ ناول کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ ناول مصر کی تاریخی روایات کا امین ہے۔ نجیب نے اس ناول میں مصر کی تاریخ، دریائے نیل، قاہرہ، ماڈی جیسے علاقوں کا ذکر کر کے ان کو امر کر دیا ہے اور قارئین کو بہت محظوظ کیا ہے۔ اس ضمن میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

> "بحیثیت تاریخ، محفوظ کے لئے مصر کا نعم البدل دنیا کا کوئی دوسرا خطہ نہیں ہے۔ قدامت میں تاریخ سے ماورا، جغرافیائی اعتبار سے دریائے نیل اور اسکی زرخیز وادی کے سبب یکتا، محفوظ کا مصر تاریخ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔۔۔ ہمیشہ سے فاتحوں، مہم جویوں، مصوروں، ادیبوں، سائنس دانوں اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور ان معنوں میں اس ملک کی جو حیثیت رہی ہے وہ انسانی تاریخ میں کسی دوسرے ملک میں نہیں رہی۔۔۔" (۵)

قاہرہ شہر ان کی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ نجیب نے قاہرہ کے تاریخی مقامات، قدیم محلات کو شاندار طریقے سے پیش کیا ہے اور انہی علامات میں سے ایک علامت دریائے نیل ہے جو پورے جوبن کے ساتھ اس تاریخی شہر کے بیچ بہہ رہا ہے اور قاہرہ کے باسیوں کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ اس دریا میں موجود کشتی گھروں میں سے ایک کشتی گھر اس ناول کا مرکز ہے اور وہاں رہنے والے مکینوں کی زندگیوں کا مرکز بھی۔ یہ کشتی گھر انسانی تدبر کی آخری پناہ گاہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کشتی گھر میں طلوعِ آفتاب، غروبِ آفتاب اور چاند کے مد و جزر کے مناظر دریائی مخلوق کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے بڑے

دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک عیاشی کا اڈہ بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ تمام چیزیں جو روئے ارض پر حرام سمجھی جاتی ہیں، کشتی گھر میں جائز معلوم ہوتی ہیں۔

نیر عباس زیدی لکھتے ہیں:

> "کشتی گھر ان دانشوروں کی پناہ گاہ ہے جو معاشرے کی مروّجہ روایات اور رجحانات سے راہِ فرار اختیار کیے ہوئے ہیں لیکن جلد ہی ان کی یہ چھوٹی سی دنیا گھٹن اور یکسانیت کا شکار ہو کر بکھر جاتی ہے۔ یہ ان معاشروں کا المیہ ہے جو آزادیٔ ورائے خیال کی پابندیوں کا شکار ہیں۔ ان معاشروں کے دانشور تنہائی اور بیگانگی میں پناہ لے کر اندر سے ٹوٹ جاتے ہیں۔"(۶)

یہ ناول اپنے عہد کے اس نوجوان طبقے سے متعلق ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین، باشعور تو ہے مگر نشے کی عادت کی وجہ سے اخلاقی اور روحانی دیوالیہ پن کا شکار ہو چکا ہے اور انہوں نے دریائے نیل پر اپنی ایک الگ دنیا بسائی ہوئی ہے۔ اس ناول کے کردار باتوں سے فلسفی تو معلوم ہوتے ہیں مگر وہ سارے دوست شام کو زندگی کی الجھنوں سے عارضی چھٹکارہ پا کر "پاؤڈر" اور "تمباکو" کی ایک محفل سجاتے ہیں اور صبح پھر سے اپنے معمول کے کاموں پر آجاتے ہیں۔ یہ تمام افراد مصر کے درمیانے طبقے کے کردار ہیں اور قاہرہ میں زندگی کی آمد و رفت کا نشان ہیں۔ یہ تمام دوست معاشرے کے بڑے کار آمد رکن ثابت ہو سکتے ہیں لیکن ایک محکوم قوم کی حیثیت سے ان کی سوچ بھی محکومیت کا شکار ہے۔ ان کی سوچ ملاحظہ ہو:

> "جب تک کشتیاں سلامت ہیں، رسے اور زنجیریں مضبوط ہیں۔ عم عبدہ جاگ رہا ہے اور حقہ تازہ ہے۔ اس وقت تک ہمارا کسی اور چیز سے کوئی تعلق نہیں۔" (۷)

اس ناول کی خاصیت یہ ہے کہ کہانی میں کردار بہت سے ہیں لیکن ہیرو موجود نہیں ہے اور یہ صرف نجیب کا ہی خاصہ ہے کہ اس نے کرداروں کو ایسے ترتیب دیا کہ کوئی فرد بھی مکمل شخصیت بن کر نہیں ابھرا بلکہ ایک ریزہ ریزہ ہوئی عمارت کی طرح منتشر عناصر کا بنا ہے اور یہ مصنف کے وسیع تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ چاہے شراب نوشی، مہم جوئی، جنسی تجربات میں شدت ہو یا قلت۔ نجیب سب سے آراستہ ہے جس طرح اس ناول میں حقہ مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرے کرداروں کے گرد گول گھومتا ہے، اسی طرح ان سب کرداروں کی زندگیاں بھی ایسے گھومتی ہیں جیسے سورج کے گرد سیارے۔

یہ سب لوگ نشے میں دھت ملک و قوم کی بہتری کے لئے بڑے بڑے مشورے دیتے ہیں اور بڑی بڑی ہانکتے ہیں۔ یہ گوشت کی قیمت، محکمہ خوراک کے مسائل اور کسانوں، مزدوروں سے متعلق سوچتے ہیں۔ کرپشن، کرنسی، سوشلزم پر بات کرتے ہیں۔ شمالی ویت نام اور کیوبا کے مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر صبح کے وقت اپنے دفاتر میں سرخ آنکھوں کے ساتھ نشے میں مخمور نیم پاگل دکھائی دیتے ہیں اور کچھ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان کا نشہ ہی دراصل ان کی زندگی ہے۔ اور وہ سب ایک ہیجانی کیفیت میں اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ یہ ہیجان صرف مصر تک محدود نہیں بلکہ دنیا کا ہر معاشرہ اسی ہیجان میں مبتلا نظر آتا ہے۔ خواہ یہ پاکستان کا معاشرہ ہی کیوں نہ ہو۔ نجیب نے فطرت نگاری کی آڑ میں ایسی ایسی

باتیں کہہ دی ہیں جو بہت پُر معنی ہیں۔ انیس ذکی جیسے کردار کے پیچھے نجیب محفوظ چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کردار کی شکل میں ان کے کچھ مکالمے حقیقت نگاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

" رات جھوٹ ہے کیونکہ یہ دن کی نفی ہے۔ جب اجالا ہو جاتا ہے تو زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔" (۸)" فاتر العقل لوگوں کی محفل بھی تنہائی سے بہتر ہے۔"(۹)

یہ ناول اگرچہ عرب پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن اس ناول کو نیئر عباس زیدی نے اس مہارت سے اردو زبان کی سرزمین پر اتارا ہے کہ اس کی جڑیں کہیں کہیں پاکستانی معاشرہ میں پیوست معلوم ہوتی ہیں۔ ترجمہ کی زبان اس قدر سہل اور رواں ہے کہ اس میں کسی بھی مقام پر کسی قسم کی اجنبیت کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ نیئر عباس کا کمال ہے کہ انہوں نے ترجمہ کرتے وقت اصل متن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ترجمہ کے دوران ناول کی صنف کے تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ مصر کی قدیم تہذیب کو اردو میں متعارف کرانے کے لیے ایک طاقتور اسلوب کی ضرورت تھی اور یہ نیئر عباس کے متنوع اسلوب کا ہی کرشمہ ہے کہ " آبِ نیل پہ آوارگی" میں مصر کی تہذیب اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کے اسلوب میں تازگی بھی ہے اور شگفتگی بھی جو کسی بھی موقع پر نہ تو قاری کو ابہام کا شکار ہونے دیتی ہے اور نہ ہی بدمزہ کرتی ہے۔ ترجمہ اس قدر رواں زبان میں کیا گیا ہے گویا کہ ناول کی اصل زبان اردو ہی ہو۔ اس ناول کا ترجمہ یقیناً اردو زبان وادب میں ایک اہم اضافہ ہے جس کو نقادانِ ادب اور تشنگانِ علم فراموش نہ کر سکیں گے۔

(افراح القبہ ۱۹۸۱ء) "شادیانے"

نجیب محفوظ نے اس ناول کو ۱۹۸۱ میں "افراح القبہ" کے نام سے لکھا۔ جس کا انگریزی ترجمہ کے نام سے ہوا اور اردو ادب میں فہمیدہ ریاض نے بطور مترجم اس ناول کو "Wedding Songs" "شادیانے" کے نام سے متعارف کرایا۔

نجیب اپنے ناولوں اور کہانیوں میں اپنی دنیا خود تخلیق کرتا ہے جو کسی سے ہرگز مستعار نہیں۔ ان کی لکھی ہوئی چیزوں میں ابہام اور علامت نگاری اتنی بڑھ گئی ہے کہ خود مصری بھی کہانی کے مجموعی تاثر کو کسی حد تک سمجھ لینے کے باوجود تفصیلات کے ساتھ مفاہیم کو پانے میں دقت محسوس کرتے ہیں اور اکثر تنقید نگار انکی تنقید و تعبیر سے دامن بچا کر گزر جانے کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر کہانیوں کے مجموعی طور پر دو موضوعات ہی نکلتے ہیں اول یہ کہ مصری قوم کا حکمرانوں کی روش سے لاتعلقی کا رویہ، دوم یہ کہ عرب اسرائیل تصادم۔ ان دو باتوں پر نجیب نکتہ چینی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور امن کے داعی ہیں۔ اسی وجہ سے اسرائیل نے انہیں " رجل السلام" (امن کا نمائندہ) قرار دیا۔ نجیب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادب امر واقع کے مقابل ایک انقلابی اقدام ہے نہ کہ اس کی تصویر محض۔ وہ صرف اپنے قلم کی ایک جنبش سے قوموں کے انقلاب کی امید رکھتے ہیں اور ادب کو قوموں کی تقدیر سنوارنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

اس ناول کا اسلوب بیانیہ ہے اور اس میں بہت سے واقعات کو چار مختلف کرداروں اور زاویوں سے دیکھنے کا تجربہ کیا گیا ہے۔ کہانی کار ایک گھر کی کہانی کو مختلف کرداروں کے نکتہ نظر سے بار بار بیان کرتا ہے اور آخر میں مرکزی کردار خود کہانی بیان کرتا ہے۔ ناول پڑھتے پڑھتے قاری متجسس ہو جاتا ہے کہ آخر میں مرکزی کردار کی اصل کہانی کیا ہو گی؟ وہ ایک

ادیب کی زندگی کو لوگوں کے نکتہ نظر سے اس لئے بیان کرتا ہے کہ قاری کو اندازہ ہو کہ ایک ادیب کے بارے میں عوامی رائے کیا ہوتی ہے؟ اور آخر میں اس کو اپنے کردار سے اس لئے کہلواتا ہے تاکہ حقیقت کا ادراک ہو سکے۔ نجیب ہمیں اس بات کا احساس بھی دلانا چاہتے ہیں کہ ایک ڈرامہ اور حقیقی زندگی میں مماثلتیں اور اختلافات کس حد تک ہو سکتے ہیں؟ ڈرامے کی سی مثالیت پسندی حقیقی زندگی میں کیونکر نہیں ہوتی؟ تصور، تخیل اور حقیقت کس مقام پر جا کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں؟ یہ ناول اس بات کا شاہد ہے کہ محفوظ کی کہانیاں کس طرح اور کیوں ثقافتی حدبندیوں سے آزاد ہو کر عوام کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ ماہنامہ اوراق میں ادیب سہیل لکھتے ہیں:

"اس ناول کا منظر نامہ اور معاشرہ ان لوگوں کا ہے جو دکھی ہیں، استحصال کا شکار ہیں، غربت کے بوجھ تلے دبے ہیں۔ غرض وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جو تیسری دنیا کے ممالک میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن سے انہیں ابھی آزاد ہونا باقی ہے"۔ [۱۰]

اس ناول کا نام" افراح القبہ" اس لئے رکھا گیا کیونکہ اس میں ادیب کا کردار جو ڈرامہ پیش کرتا ہے اس کا نام طنزاً "افراح القبہ" ہی رکھ دیا حالانکہ اس پورے ناول میں یاس اور حزن ہے اور خوشی کے گیت کہیں بھی سنائی نہیں دیتے۔ اس ناول کی ساری کہانی " بیت القدیم" کے گرد گھومتی ہے جو کہ شاید نجیب کے نزدیک مایوسی اور غم کا ایک استعارہ ہے۔ اس ناول میں انتشار اور تیرگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ شاید کہ یہ انتشار بیسویں صدی میں عرب معاشرے کا مقدر تھا جس کو نجیب نے اپنی کہانیوں میں سمو دیا۔ اس ناول کے مرکزی کردار چار ہیں جو کہ طارق رمضان، کرم یونس، حلیمہ الکبش اور عباس کرم یونس کی صورت میں مترشح ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ثانوی حیثیت کے کرداروں میں سالم العجرودی، سرحان الہلالی، فواد شبلی، اُم ہانی، اسماعیل، دریہ، عم احمد برجل اور تحیہ ہیں۔ ان کے کردار عام زندگی کے عام لوگ ہیں جنہیں ہم کسی بھی معاشرہ میں چلتے پھرتے دیکھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کے کردار مثالی ہونے کے بجائے حقیقی زندگی کے کردار ہیں جو خطا کے پتلے ہیں اور اپنی خامیوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انہیں مثالیت پسندی سے نفرت ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

" مثالی انسان سے بڑھ کر کوئی سفاک نہیں ہوتا۔ دنیا بھر میں سارے خون خرابے کا ذمے دار کون ہے؟ یہی مثالی انسان"۔ [۱۱]

دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ شدہ اس کہانی میں ہر معاشرہ کو گویا اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ اس کے کردار پاکستانی معاشرہ میں بھی اسی طرح متحرک دیکھے جا سکتے ہیں جیسا کہ عرب معاشرہ میں۔ سالم العجرودی تھیٹر میں ہدایت کار ہے اور یہاں پیش کیے جانے والے سب ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ جب بھی کسی نئے ڈرامے پر کام کرنا ہو تو وہ سب اداکاروں کی موجودگی میں بلند آواز میں ڈرامہ پڑھ کر سناتا ہے تاکہ سب لوگ اپنے اپنے کردار کو جان سکیں۔ مکالمہ ادا کرتے وقت مردانہ یا نسوانی کرداروں کے مطابق اس کی آواز ملائم یا کرخت ہوتی رہتی ہے۔ یہ آواز دنیا کے کسی بھی خطہ میں سنی جا سکتی ہے۔

نجیب محفوظ کے اس ناول کو اردو میں ترجمہ ہونے کے بعد پاکستانی معاشرہ میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔اس کا ترجمہ حقیقت سے قریب ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔زبان کی روانی اور موضوع کی دل چسپی کے باعث یہ ناول قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔اس ناول کی مترجم فہمیدہ ریاض بنیادی طور پر شاعرہ ہیں لیکن ترجمہ کے میدان میں بھی خاص شہرت رکھتی ہیں انہوں نے کمال مہارت سے مولانا روم کی مثنوی کا اردو میں ترجمہ کیا۔علاوہ ازیں شاہ عبد الطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کی شاعری کے بھی تراجم کیے۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ترجمہ کی نزاکتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجمے "شادیانے" میں کہیں بھی کوئی جھول نہیں پایا جاتا بلکہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

(اللص والکلاب ۱۹۶۲ء)"چور اور کتے"

نجیب محفوظ نے ایک عرصے تک لکھنا چھوڑے رکھا۔۱۹۶۲ء میں ان کا ناول " اللص والکلاب" منظر عام پر آیا جسے قارئین کی طرف سے بہت پذیرائی ملی۔اس کا کسی بھی زبان میں ترجمہ نہ ہو سکا۔مگر جیسے ہی نجیب کو ۱۹۸۸ء میں نوبل انعام ملا تو پبلشروں کا انکے پیچھے تانتا بندھ گیا۔۱۹۸۹ء میں نجیب کے تین ناول انگریزی میں ترجمہ ہو کر قارئین کی توجہ کا مرکز بنے۔ان ناولوں میں سے ایک ناول جو کہ انگریزی قارئین میں بہت مقبول ہوا اور اس مقبول ترین ناول کا تھا۔" The thief and the dogs" ترجمہ "چور اور کتے" کے نام سے ۲۰۰۷ء میں سید علاؤالدین نے اردو زبان میں کیا۔سید علاؤ الدین کا شمار اردو ادب کے نمایاں ترجمہ نگاروں میں ہوتا ہے۔یہ ناول کراچی سٹی بک پوائنٹ سے شائع ہوا اور اردو کے اہل علم و ادب کی توجہ سمیٹی۔"چور اور کتے" نجیب محفوظ کا ایک مشہور ناول ہے۔جس کا ترجمہ سید علاؤ الدین نے پورے فنی واسلوبی محاسن کے ساتھ کیا ہے۔یہ ناول پاکستان کی معاشرت کے بھی قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ترجمہ ہونے کے باوجود اس ناول میں ایسی کشش ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ ناول اودو زبان میں ہی لکھا گیا ہے۔سید علاوالدین بھی ترجمہ کے میدان کے ماہر ہیں۔"چور اور کتے" کے علاوہ انہوں نے نجیب محفوظ کے ایک اور ناول کا ترجمہ "عام لوگ" کے نام سے کیا ہے۔انہوں نے نجیب محفوظ کی کہانیوں کے مجموعے کا ترجمہ "دوسرے جہان کی آوازیں" کے نام سے کیا۔سید علاوالدین بیس سے زائد علمی شہرت یافتہ کتب کے تراجم کر چکے ہیں جن میں سے چند اہم کتب اور ان کے مصنفین "چارلس ڈارون کی خود نوشت" از چارلس ڈارون، "خوش رہنے کا فن" از دلائی لامہ،" چھٹکارا" از ژاں پال سارتر،" عظیم وراثت" از چارکس ڈکنز اور" شیکسپیئر کی کہانیاں" از ولیم شیکسپیئر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔"چور اور کتے" میں سید علاوالدین نے فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔اس ناول کا تعارف کراتے ہوئے ادیب سہیل لکھتے ہیں:

> "نجیب نے اس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی ہے۔یہ کہانی ایک چور سید مہران کے گرد گھومتی ہے جس کے کردار میں روبن ہڈ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔اس ناول کا مقام وقوع مصر ہے اور زمانۂ واردات ۱۹۵۲ء ہے جب کرنل جمال ناصر اور ان کا انقلابی دستہ بادشاہت کا خاتمہ کر چکا تھا۔" (۱۲)

نجیب کا یہ ناول" چور اور کتے" دراصل بیسویں صدی کے عرب معاشرے کی تیرگی کا ایک استعارہ ہے۔ جہاں مختلف مسائل کا شکار عام آدمی غربت، احساس محرومی، افسردگی اور یاس میں گھرا ہوا ہے اور مکمل طور پر فلاکت زدہ ہے۔ یہ سب مسائل اسے ذہنی انتشار کی طرف لے جاتے ہیں اور پھر وہ ایسی ایسی برائیاں کر بیٹھتا ہے جن کا وہ خود خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ اس سب کے پیچھے حقیقت میں وہ معاشی ناہمواریاں ہیں جو کہ صدیوں سے عرب معاشرے کا خاصہ رہی ہیں، اس کے پیچھے وہ استحصالی طبقہ مجرم ہے جو زمانہ ازل سے مظلوم کا حق مارتا چلا آرہا ہے یہ ناول اس مظلوم طبقے کی ایک کروٹ ہے اور نجیب محفوظ اس مظلوم طبقے کو جگا رہا ہے کہ اٹھو! خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور ان مطلق العنان بادشاہوں کے خلاف اپنی جنگ خود لڑو اور ان کو نیست و نابود کرو۔ تیسری دنیا کے تمام ممالک کا تقریباً یہی حال ہے اور اسی اعتبار سے یہ کہانی ہم پاکستانیوں کو بھی اپنا دکھ معلوم ہوتی ہیں۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر سفیر حیدر لکھتے ہیں کہ:

> "چور اور کتے" کو بطور نفسیاتی ناول شناخت کیا گیا ہے۔ یہ انتقام کی بھول بھلیوں میں ہر لحظہ منہ کے بل گرتے 'بیمار آدمی کی کہانی ہے۔۔۔ 'چور اور کتے' مختصر مگر گہری وجودی نفسیات اور سماجی بصیرت کا حامل ناول ہے۔ اس میں شامل بلیغ جملے نجیب محفوظ کے اسلوب میں پنہاں معنوی دبازت اور کثیر تعبیروں کے حامل ہیں"۔ (۱۳)

یہ ناول اس چور کی کہانی ہے جو کہ حقیقتاً چور نہیں تھا بلکہ معاشی بندھنوں نے ایک مجرم بنا دیا۔ وہ ایک پڑھا لکھا شخص ہے لیکن وہ معاشرے کا فعال رکن نہیں بن سکا اس کا ضمیر اسے مسلسل کچوکے لگاتا ہے لیکن وہ اپنے ذہنی انتشار کے باعث مجبور ہے اور ایک چور سے قاتل بن گیا ہے۔ وہ اپنی زندگی سے ہار چکا ہے، مکمل طور پر تھک چکا ہے لیکن اسے موت بھی نہیں آرہی۔ وہ اپنے مجرموں سے بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن اس کی یہ خواہش بھی کسی طرح پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتی۔ یوں وہ لگاتار تخریب کاریوں میں لگا ہوا ہے اور لگاتار اس کے ضمیر کی ملامت بھی جاری ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ وہ محرم سے مجرم بن گیا ہے۔ اس کے ہر منصوبے کا خالق رؤف جب اسے چھوڑ جاتا ہے تو اس کے اندر انتقام کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ وہ خود کلامی میں کہتا ہے:

> "تم ہی نے مجھے بنایا اور تم ہی رد کر رہے ہو۔ تمہارے ہی منصوبے مجھ میں تشکیل پائے اور پھر تم نے اسے تبدیل کر دیا۔ اس طرح میں کہیں کا نہ رہا، جس کی کوئی جڑ نہ ہو، بے وقعت، بلا کسی امید کے۔ یہ ایک بے وفائی ہے کریہ اور گھناؤنی"۔ (۱۴)

اس ناول میں نجیب نے" کتے" کا لفظ ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز اس انتشار، مایوسی اور اندھیرے کے خوف کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ناول کے کردار سید مہران کے ذہن میں رہتا ہے۔ اور" کتا" کہہ کر مصنف نے دراصل ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو معاشرے کے وڈیرے ہیں اور احساس محرومی کے غلیظ جراثیم معاشرے میں پھیلاتے ہیں۔ یہ لوگ صرف معاشرے کو جڑوں تک نوچتے اور کھاتے ہی نہیں بلکہ اس کو مثبت سوچ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ناول میں جا بجا کتوں کی آواز یا خود کتے یہی دو علامتیں ہیں۔ سید سوچتا ہے کہ ان تین کتوں کو کیسے موت

کی نیند سلایا جائے۔ وہ رؤف کے عالی شان گھر میں چوری کا سوچتا ہے کہ یہی اس کا علاج ہے۔ اسی نے تو مجھے یہ سب کچھ سکھایا تھا۔ وہ رات کے وقت بڑی مہارت سے اس کے گھر کی چھت سے کمرے میں جانے میں کامیاب تو ہو جاتا ہے لیکن بر وقت پکڑا جاتا ہے اور رؤف کے عتاب کا سامنا کرتا ہے۔ لیکن سید اسے کہتا ہے کہ میں جب سے جیل سے رہا ہوا ہوں، عجیب طرح سے وحشت زدہ ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسے نہیں کیا۔ نجیب محفوظ اس چوری کی واردات کو ایسے انداز سے لکھتا ہے جیسے وہ خود ایک ماہر چور رہا ہو۔ اس کی معاشرے میں ہونے والی ہر اچھائی اور ہر برائی پر نظر ہے اور اس کا مشاہدہ قابل ستائش ہے۔ وہ ایک چور کی زندگی کا بھی اسی طرح مشاہدہ کرتا ہے جیسے کہ کسی قابل فخر انسان کا۔ یہی نجیب محفوظ کی بطور لکھاری بہترین خوبی ہے۔

(الحرافش ۱۹۷۷ء)"عام سے لوگ"

اس ناول نے نجیب محفوظ کا ناول " الحرافش " کے نام سے عربی میں شائع ہوا۔ "The Harafish" کے نام سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر پوری دنیا میں بہت مقبولیت پائی اور اسے عوام کی طرف سے بہت پذیرائی ملی۔ سید علاؤ الدین نے اس شاندار ناول کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے اس کو دوام بخشا۔ اس طرح یہ ناول " عام سے لوگ " کے عنوان سے اردو زبان میں ۲۰۱۲ء میں سٹی بک پوائنٹ، کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔ حرافش کا مطلب کسی حد تک ہم " عام لوگ " کہہ سکتے ہیں لیکن یہ لفظ بھی اس کے ترجمے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تو اس کا عربی نام ہی رکھنے کو ترجیح دی گئی واشنگٹن پوسٹ کے مبصر رابرٹ رون نے " حرافش " کا مطلب کچھ اس طرح لکھا ہے:

"Hood lums, harlots and holy men"(۱۵)

ناول کا یہ نام ایک طرح سے پورے ناول کا ایک خلاصہ ہے۔ اور یہ نام پورے ناول میں عام، عوام کی حیثیت سے ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ ناول دس ابواب پر مشتمل اپنی نوعیت کا تاریخی، رزمیہ اور قسط وار ناول ہے۔ یہ عام لوگوں کے ایک خاندان کی درجنوں نسلوں کی کہانی ہے۔ جس کے درجنوں افراد قبیلے کے سردار بنتے ہیں۔ کچھ عام لوگوں کو نفع پہنچاتے ہیں اور کچھ رشوت خور اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ یہ خاندان ترقی کی رفعتوں بلندیوں اور عظمتوں سے شروع ہوتا ہے لیکن اگلی اولادیں برائی کے دہانے پر آ کر کھڑی جاتی ہیں۔ لیکن آخر میں اسی خاندان کی اولاد میں سے ایک اور "عاشور الناگی" پیدا ہوتا ہے جو اپنے اسلاف کی نیک نامی کو پھر سے زندہ کر دیتا ہے۔ یہ ناول کہیں کہیں انگریزی کے دو ناولوں سے مشابہہ ہے۔ " Palace Walk" اور "Children of Alley" اس کا اختتام اچھائی پر یوں ہوتا ہے جیسے آخری نسل نے حقیقی مسرتوں کو اپنانے کا وعدہ کر رکھا ہو۔ نجیب کا قلم مصری معاشرے کی رومانی فضا کی عکاسی کرنے سے بالکل باز نہیں آتا اور غربت کے مسائل کی ترجمانی بھی بڑے خوبصورت انداز میں کرتا ہے۔ ادیب سہیل اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس میں وہ مشکوک مرد بھی ہیں جن کی چمکتی آنکھیں انکی جرائم پیشگی کی مظہر ہوتی ہیں اور تھل تھل سینوں والی عورتیں بھی ہیں جو بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ حرافش اپنے متن کے کی مصری صورت ہے۔ "Less Miserable" اعتبار سے کسی فنکار کے فن کے بارے میں اس طرح کی قیاس آرائیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ عظمت کوئی معلق شے یا کوئی خود رو پودا نہیں۔ یہ ایک تسلسل کا مرہون ہے۔" (۱۶)

نجیب کے اکثر ناول اور کہانیاں مابعد جنگ کی صورت حال پیش کرتی ہیں۔ دورانِ جنگ غیر ملکی افواج کی موجودگی کی وجہ سے جو مشکلات و مسائل مصری عوام کے حصے میں آئے یا انقلاب مصر سے پہلے کی بادشاہی کی مکروہات کی آئینہ داری کرتی ہے۔ جنگ عظیم دوم میں ایک محاذ مصر کی سرزمین پر بھی کھولا گیا تھا۔ نتیجتاً انگریز اور امریکی افواج سرزمین مصر میں دندناتے پھرتے تھے۔ یہ خرابی صرف انہی فوجیوں سے ہی خاص نہیں، دنیا بھر میں جہاں کہیں اس طرح کی افواج گئیں اور انہیں ایک عرصے تک قیام کرنے کا موقع ملاہے۔ تو ان کی موجودگی نے وہاں ہر طرح کی معاشی اور معاشرتی خرابی اور بد قماشی کے سر اٹھانے کی راہ ہموار کی ہے۔ اور ایسے موقع کی تاک میں رہنے والوں کو کھل کھیلنے کی چھٹی مل گئی اور دیکھا یہ گیا کہ مقامی " گاڈ فادرز" اور اشرافیہ اپنے تمام حواریوں کے ساتھ اپنی اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے۔

محفوظ کا یہ ناول اعلیٰ درجے کے داستان گو کی صلاحیتوں سے پر غنائی تمثیل کا حامل ہے جس میں کردار ڈگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اور اس کا گونج دار انداز ایک پر افتخار رزمیہ نظم کا پیش نامہ معلوم ہوتا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نجیب کہانی لکھتے ہوئے کرداروں کے منصف نہیں بنے جیسا کہ ان کے دوسرے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ اس ناول کے پلاٹ میں محل وقوع اور وقت مکمل طور پر واضح نہیں ہیں۔ لیکن کسی حد تک یہ کہانی قرونِ وسطیٰ کے زمانے کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ طاعون کی بیماری، ہلاکتیں، قبیلے کا چیف بننا وغیرہ سب اسی دور کی کہانیاں ہیں لیکن ناول کے آخر میں یہ کہانی جدید دور میں داخل ہوتی نظر آتی ہے ناول وقت اور مقام واضح نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کہانی وقت کی زنجیروں سے آزاد ہر قوم، ہر طبقے، ہر علاقے کی نسلوں سے متعلق ایک آفاقی سچائی ہے۔ اس ناول کے بارے میں سہیل ادیب، رابرٹ اردن کے الفاظ نقل کرتے ہیں کہ:

"حرافش کا فارم روایتی مشرقیت لیے ہوئے ہرگز نہیں ہے جیسا کہ مغرب زدہ انٹیلیکچویل دور دراز بیٹھ کر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ نجیب محفوظ کو اپنی اس تحریر اور دیگر تحریروں پر اس بات کا مکمل ایقان ہے کہ ان کا رشتہ سراسر اس کی اپنی ہی دنیا سے ہے۔" (۱۷)

نجیب محفوظ ایک زود نویس لکھاری تھے۔ ان کے بے شمار ناول، افسانے، ڈرامے اور دیگر تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنے میں گزارا۔ ان کی تمام تر تحریریں مصری تہذیب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ تہذیب اپنے اندر کئی صدیوں کو سموئے ہوئے ہے۔ نجیب محفوظ نے کمال مہارت سے اس قدیم و جدید تہذیب کے نقوش کو اپنی تحریروں کے کینوس پر یوں اتارا ہے کہ اس سے رنگ برنگ تصویریں ابھرتی مٹتی، چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ ان کے اس فن کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی اور انہیں نوبیل انعام سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے اردو زبان سمیت دنیا کی کئی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اردو زبان میں ترجمہ ہونے والے ناولوں کی تعداد صرف چار ہے۔ اگرچہ یہ تعداد بہت کم ہے اور نجیب محفوظ کے کئی شاہکار ناولوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان چاروں ترجمہ شدہ ناولوں کو اردو ترجمہ کی روایت میں ایک شاندار اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ نجیب محفوظ کے ناولوں کے تینوں مترجم نیئر عباس زیدی، فہمیدہ ریاض اور سید علاؤالدین نے ناولوں کے تراجم میں فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے اور مصر کی تہذیب کے مرقعے یوں صفحۂ قرطاس پر اتارے ہیں کہ ان میں کہیں کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان ترجمہ شدہ ناولوں پر اردو زبان کے ناول ہونے کا ہی گمان گزرتا ہے۔ یہ تمام تراجم دراصل ترجمہ در ترجمہ ہیں اور نجیب محفوظ کے ناولوں کے انگریزی تراجم سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ترجمہ در ترجمہ، براہِ راست ترجمہ سے زیادہ مشکل امر ہے کیونکہ اس صورت میں ترجمہ نگار کے لیے اصل متن کی روح کو برقرار رکھنا از حد مشکل ہو جاتا ہے۔ اس روشنی میں اگر ان تراجم کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تینوں مترجم فنی چابکدستی سے اس مشکل پر قابو پاتے نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مترجم، ترجمہ کی پیچیدگیوں سے نہ صرف بخوبی آگاہ ہیں بلکہ ترجمہ کے میدان کے شاہسوار بھی ہیں اور ترجمہ کے کئی مشکل مراحل طے کر چکے ہیں۔ نجیب محفوظ کے ناولوں کے تراجم کے سلسلے میں ان تراجم کو بلاشبہ ایک اہم سنگِ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ منور آکاش، مرتب و مترجم، فکشن کی تعمیر (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ص: ۴۳۔

2. https://www.nobelprize.org/nobel_prizes/literature/laureates/1988/mahfouz-article.html (مورخہ ۲۶ دسمبر، ۲۰۱۷)

۳۔ باقر نقوی، نوبیل ادبیات (لاہور: اکادمی بازیافت، س۔ن)، ص: ۱۹۴۔

۴۔ نجیب محفوظ، آبِ نیل پہ آوارگی، مترجم نیئر عباس زیدی (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء)، ص: ۹۔

۵۔ نجیب محفوظ، چور اور کتے، مترجم سید علاؤالدین (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۷ء)، ص: ۱۲۔

۶۔ نجیب محفوظ، آبِ نیل پہ آوارگی، مترجم نیئر عباس زیدی، ص: ۱۶۶۔

۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۶۔

۸۔ ایضاً، ص: ۱۱۵۔

۹۔ ایضاً، ص: ۸۴۔

۱۰۔ ادیب سہیل، "نوبل لاریٹ نجیب محفوظ"، اوراق ۲۱ (جنوری فروری ۱۹۹۹)، ص: ۲۹۶۔

۱۱۔ نجیب محفوظ، شادیانے، مترجم فہمیدہ ریاض (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۹ء)، ص: ۱۵۔

۱۲۔ ادیب سہیل، "نوبل لاریٹ نجیب محفوظ"، ص:۲۹۵۔

۱۳۔ ڈاکٹر سفیر حیدر، "نجیب محفوظ کی تخلیقی حسیت"، تحقیق نامہ ۲۰ (جنوری تا جون ۲۰۱۷ء)، ص:۱۷۲۔

۱۴۔ نجیب محفوظ، چور اور کتے، مترجم سید علاؤالدین، ص: ۴۲۔

۱۵۔ ادیب سہیل، "نوبل لاریٹ نجیب محفوظ"، ص:۲۹۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص:۲۹۶۔

۱۷۔ ادیب سہیل، "نوبل لاریٹ نجیب محفوظ"، ص:۲۹۷۔